R. No. 2186/57
Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs 4/-
Per Copy -/12 P

جلد ۲۵۔ شمارہ ۴۲ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ نومبر ۱۹۶۶ء

اداریہ

جواہر لال نہرو کی یاد میں

(۱)

۱۴ نومبر کو جواہر لال نہرو کا جنم دن ہے۔ یہ دن سارے ملک میں منایا جائے گا۔ اس دن کے احترام میں ہمارا فرض ہے کہ جس محبت، خلوص، دلسوزی اور جانفشانی کے ساتھ جواہر لال نہرو نے ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت کی اسے یاد کریں، ان کے عظیم تصورات اور بلند مقاصد کو ذہن میں رکھیں، عوام سے ان کی طرح محبت پیدا کریں، ان کی خوئے دلنوازی پر دھیان دیں، ان کی سی وسعت نظر لائیں اور جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے نصب العین پر ان کا سا ایمان تازہ کریں۔

جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ کہا تھا:-

"ہماری منزل آخر ایک غیر طبقاتی سماج کا قیام ہی ہو سکتی ہے جس میں سب کے لیے برابر کے مواقع ہوں اور اقتصادی اعتبار سے سب برابر ہوں۔ ایک ایسا سماج جو منصوبہ بندی کے ذریعہ سے منظم ہو اور جس کے ذریعہ انسانی کو بلند مادی اور تہذیبی معیار ملیں، جس میں تعاون کی روحانی قدروں پر زور ہو، جس میں بے غرضی ہو، خدمت کی لگن ہو، صحیح بات کرنے کی تمنا ہو، ایک دوسرے کے لیے خیر سگالی کا جذبہ ہو، ایک دوسرے سے محبت ہو اور جو بالآخر ساری دنیا کے لیے ہو۔ اس منزل کے راستے میں جو بھی رکاوٹ ہے اسے دور کرنا پڑے گا، ہو سکا تو نرمی سے اگر مجبوری ہوئی تو زبردستی بھی۔"

جواہر لال نہرو کے سامنے یہ نصب العین تھا۔ انھوں نے اس نصب العین کی طرف نہ صرف ملک و قوم کو دعوت دی، بلکہ اس کی طرف قدم بھی اٹھائے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب کم ہوئے۔ انھیں ناکامیوں سے زیادہ سابقہ پڑا۔ اس میں ان کا قصور بھی تھا، مگر ان کی پارٹی، ملک و قوم کے عام ذہن اور سیاسی فضا کا زیادہ۔ ہمارا ملک غلامی کے دور سے ابھی نکلا ہے۔ انگریزوں کی غلامی نے ذہنوں کو مسخ کر دیا تھا۔ لوگوں میں صحیح معنی میں قومی احساس پیدا ہی نہیں ہوا ہے، ابھی تک برادری، ذات پات، فرقے، علاقے، زبان، اقتصادی مفاد کا دباؤ زیادہ ہے۔ اخلاقی اصول زندگی کا مزاج نہیں بنے ہیں صرف وظیفۂ لب ہیں۔ اقتدار کی ہوس عام ہے۔ گروہ بندی اور جتھے بندی کی طرف میلان زیادہ ہے، نمود و نمائش بہت ہے، خاموش خدمت کا ولولہ کم، دوسروں سے امداد کی توقع زیادہ ہے، اپنی صلاحیتوں پر تکیہ نہ ہونے کے برابر، اپنے ماضی کی عظمت کا احساس زیادہ ہے، حال کی پستی اور پیچیدگی کا عرفان یونہی سا ہے۔ اگر کسی کو ذرا سا نقصان پہنچ جائے تو وہ بڑی سے بڑی بساط کو بڑی بے پروائی سے الٹ دے گا۔ جمہوریت، سیکولرزم، رواداری، مساوات، قومی ذہن دستور میں رکھنے کے لیے ہیں، زندگی میں برتنے کے لیے نہیں۔ رشتے داروں کو فائدہ پہنچانا عین ایمان ہے خواہ اس سے قوم کو کتنا ہی نقصان پہنچ جائے۔ دوسروں پر کیچڑ اچھالنا عام ہے۔ اپنے لیے رندی اور دوسرے کے لیے پرہیزگاری کا مسلک بہت مقبول ہے۔

اس لیے اس پر کوئی تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ جواہر لال نہرو کو کیوں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ہاں ان کے نصب العین کو یاد رکھنا چاہیے ان کی ملک سے محبت کو دیکھنا چاہیے، ان کے جدید ذہن کو سمجھنا چاہیے ان کی سی ذہنی بلندی پیدا کرنا چاہیے، ان کی طرح محنت کرنی چاہیے، ان کا سا نوجوانوں سے بچوں سے اور نئے خیالات سے لگاؤ پیدا کرنا چاہیے ان کی طرح ہر تازہ ہوا اور ہر نئی کرن سے تعلق پیدا کرنا چاہیے، ان کی سی بے خوفی اور خطرے میں کود پڑنے کا جذبہ پالنا چاہیے۔ ان کی پرستش نہیں کرنی چاہیے۔ وہ بھی آخر بندہ بشر تھے اور انھوں نے بھی بہت سی غلطیاں کی تھیں۔ ہاں ان کی نگہ بلند، سخن دلنواز اور جان پرسوز، کی آج بھی ہمیں ضرورت ہے اور اس گرانی، سراسیمگی، بے یقینی اور شکست خوردگی کے دور میں اور بھی ضرورت ہے۔ اپنے میں، اپنے ملک و قوم میں اور انسانیت میں اعتماد پیدا کر کے موج حوادث سے ہنستے کھیلتے گزرنا ہوگا۔ بڑی بڑی باتیں کرنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے کاموں کو دل لگا کر پورا کرنا ہوگا تاکہ لوگوں میں کام کرنے کی عادت بڑھے اور شیخی بگھارنے کی کم ہو۔ گاندھی اور جواہر لال نہرو کے راستے پر چلنا ہوگا۔ ان کی یادگاریں قائم کر کے، ان کے ساتھ عقیدت کا اظہار کر کے، انھیں بھول

جانے سے نہ ان کے ساتھ انصاف ہوگا نہ اپنے ساتھ، نہ قوم کے ساتھ اور نہ انسانیت کے ساتھ۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم جواہر لال نہرو کی محض مدح و قدح نہ کریں بلکہ حقیقی جواہر لال کو سمجھیں اور اس کی روح کو اپنائیں۔ اس پر اگلی اشاعت میں روشنی ڈالی جائے گی۔

آذربائیجان کے عوام کی اردو نوازی

حیدرآباد۔ ۲۳ اکتوبر۔ روس کا سہ رکنی تعلیمی وفد جو آج کل ہندستان کا دورہ کر رہا ہے جب حیدرآباد پہنچا تو ایک گفتگو کے دوران وفد کے لیڈر آذربائیجان ریپبلک کے وزیر تعلیم مسٹر محمد زاہی بخشی نے انکشاف کیا کہ آذربائیجان یونیورسٹی جلد ہی اردو ہندی کی تعلیم کے لیے ایک علیحدہ فیکلٹی قائم کرے گی۔

مسٹر بخشی نے بتایا کہ لوگوں کو ہندوستان کی تاریخ اور اس کے عوام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔

تلگو کی دو کتابوں کے لیے انعامات

ساہتیہ اکیڈمی کا اعلان

حیدرآباد۔ ۲۰ اکتوبر۔ جدید تلگو ادب کے لیے انعامات دینے کی آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کی اسکیم کے تحت سال ۱۹۶۶ء کے لیے ۱۱۱۶ روپیے کے دو انعامات کا اعلان کیا گیا ہے جن میں سے ایک انعام جدید تلگو شاعری کے تحت "آندھرا پرنجم" جلد دوم مصنفہ شری مدھوناپنتلا ستیہ نارائنا شاستری کو اور دوسرا ایک تلگو ناول "وساہا نیتر الو" مصنفہ ملکا گنبھی شاستری کو دیا گیا ہے۔ اکیڈمی کے ایک پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ تلگو افسانہ کے لیے بھی عنقریب ایک انعام کا اعلان کیا جائے گا۔
(ملاپ، حیدرآباد)

سندھی زبان کو آئین کے آٹھویں گوشوارہ میں شامل کرنے کا مطالبہ

مرکزی حکومت منظور کرے گی

نئی دہلی، ۲۷ اکتوبر۔ سندھی جسے دس لاکھ سے زائد لوگ بولتے ہیں جلد ہی آئین کے آٹھویں گوشوارے میں ایک زبان کے طور پر شامل کر دی جائے گی۔ آج مرکزی کابینہ نے اس فہرست میں سندھی کے شامل کیے جانے کے امکانات پر غور کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ کابینہ اس بات کے حق میں ہے کہ سندھی کو اس گوشوارہ میں شامل کر دیا جائے۔
(سیاست جدید)

مرزا رسوا کے خلاف امراؤ جان ادا کا مقدمہ خارج ہو گیا

کراچی کی ادبی عدالت العالیہ میں ایک دلچسپ تمثیلی مقدمہ پیش ہوا جو اپنی نوعیت کا دلچسپ ترین اور انوکھا مقدمہ تھا۔ یہ مقدمہ ایک ادبی عدالت میں پیش ہوا جو پاکستان کے متعدد ادیبوں اور شاعروں کے پینل پر مبنی تھا۔ معزز ججوں میں سابق سیشن جج مہدی صدیقی، فیض احمد فیض اور ہاجرہ مسرور کے نام شامل تھے۔

یہ مقدمہ لکھنؤ کی مشہور ڈیرہ دار طوائف امراؤ جان ادا کی طرف سے اردو کے مشہور مصنف مرزا ہادی رسوا کے نام دائر کیا گیا تھا جن پر ان کی شہرت کو نقصان پہنچانے اور عزت ہتک کے الزام بھی لگائے گئے تھے۔ مدعیہ امراؤ جان ادا کی طرف سے ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر اسلم فرخی، سعیدہ عروج مظہر، محمد عمر مہاجر، میر اِبن الحسن نے پیروی کی اور اپنے دلائل پیش کیے جبکہ مرزا ہادی رسوا کی جانب سے سید سبط حسن، افتخار احمد عدنی، ابراہیم جلیس، بیگم سلمیٰ حقی، ابن انشا نے وکالت کی۔ معزز عدالت نے چار گھنٹے مقدمہ کی پوری کارروائی نہایت غور و خوض سے سننے کے بعد مقدمہ خارج کرنے کا فیصلہ کیا لیکن مدعیہ کو اپیل کی اجازت بھی دی گئی ہے۔ یہ تمثیلی ادبی مقدمہ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کراچی کی طرف سے تھیوسوفیکل ہال میں پیش ہوا جس میں ادیبوں، شاعروں اور صاحب ذوق حضرات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ مقدمہ شروع ہونے سے حضرت جوش ملیح آبادی نے مرزا ہادی رسوا کے بارے میں تقریر کی۔ عدالتی کارروائی پر مشتمل کتاب بعنوان "امراؤ جان ادا بنام مرزا رسوا" سید سبط حسن مرتب کر رہے ہیں اور عنقریب شائع کی جائے گی۔

اس عدالت کے پیشکار شان الحق حقی اور منتظم عدالت مرزا ظفر الحسن تھے۔
(سکریٹری)

کتاب پبلشرز کی دو نئی کتابیں

لکھنؤ۔ ۲۷ اکتوبر۔ ایک اطلاع کے مطابق کتاب پبلشرز چوک لکھنؤ نے دو نئی کتابیں شائع کی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) ستم ایجاد (مزاحیہ مضامین) احمد جمال پاشا۔ قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

(۲) بہار کا پہلا دن (ناول) علاءالدین آزاد۔ قیمت ۴ روپے۔

(کتاب پبلشرز چوک لکھنؤ)

شولوخوف کے بارے میں ۶۵ مصنفوں کی لکھی ہوئی کتاب

ماسکو (تاس) سوویت یونین کے ممتاز ادیب میخائل شولوخوف نوبل انعام یافتہ کی ۶۰ ویں سالگرہ کی تقریب کے سلسلے میں پچھلے دنوں ایک کتاب شائع کی گئی ہے۔ اس میں مختلف ملکوں کے ۶۵ ادیبوں، شاعروں، انشا پردازوں اور تبصرہ نگاروں کے مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب میں شائع شدہ مضامین کے علاوہ اس خاص موقع کے لیے جو مضامین تحریر کیے گئے انہیں بھی شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

اپنی طرز کا واحد اسلامی ماہنامہ "انوارِ اسلام"

"انوار اسلام" ہر ماہ کتابی سائز کے ۴۰ صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر سال بھر میں ساڑھے سات سو صفحے کی کم از کم آٹھ روپے قیمت کی کتابیں دی جاتی ہیں جب کہ سال میں صرف ۴ روپے لیے جاتے ہیں۔ محصول ڈاک بھی ادارہ خود ہی برداشت کرتا ہے۔

اب تک "انوار اسلام" میں کئی کتابیں شامل ہو چکی ہیں۔

(منیجر "انوار اسلام" رام نگر، بنارس)

ڈاکٹر رفیق حسین

مومن کا ایک شعر

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

'ہماری زبان' مورخہ یکم، اکتوبر ۱۹۶۶ء کے شمارے میں پروفیسر کرامت علی کرامت نے مومن کے مندرجہ بالا شعر کی تشریح و تنقید پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے موصوف نے ابتداہی میں فرض کر لیا ہے۔

"بعض ناقدین نے نازک خیالی کے لیے اس شعر کی بڑی تعریف کی ہے"

ناقدین کے نام بتانے کی زحمت نہیں گوارا فرمائی۔ اس جملہ کے بعد موصوف نے لکھا ہے کہ شعر کے لیے

"نازک خیالی ہی سب کچھ نہیں بلکہ شاعر کے پیچیدہ جذبات کے سادہ و ابتدائی عناصر کا مطالعہ کرتے ہوئے ابلاغ کے مختلف مدارج میں اضافی فراوانی کی تلاش ہمارا اصل مقصد ہونا چاہیے"

موصوف کی یہ عبارت کافی پیچیدہ ہے۔ اس کے بعد کرامت صاحب نے لکھا ہے کہ غزل میں ردیف و قافیے سے کس طرح تخلیقی جذبات متحرک ہو کر شاعر کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔ چند ابتدائی جملوں کے بعد مومن کے شعر کی تشریح شروع کی ہے۔

"ظاہر ہے کہ اس شعر کے پہلے مصرع میں سوختہ ساماں ہوں گے اور دوسرے مصرع میں شمع شبستاں ہوں گے۔ شاعر کے جذبات کو متحرک کرنے کے لیے ذمہ دار ہیں۔"

پروفیسر صاحب کی خدمت میں گذارش واقعی ہے کہ مومن کے ذہن کو ان فقروں نے متحرک نہیں کیا۔ ان فقروں کی مدد سے وہ بالکل مختلف شعر بھی کہہ سکتا تھا اور اب بھی دوسرے شاعر بالکل مختلف شعر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جو بات مومن نے کہی ہے وہ اس میں نہیں ہو سکتی۔ مثلاً

محفل ناز میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
جلوۂ حسن سے وہ شمع شبستاں ہوں گے

قافیے اور ردیف کی مدد سے بس ایسا ہی بے رنگ شعر کہا جا سکتا ہے ہم سب جانتے ہیں کہ مومن ایسے شیوا بیان شاعر کے لیے قافیہ پیمائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ ان فقروں کی مدد سے اردو کے مشاق شاعر مومن سے بالکل مختلف شعر کہہ سکتے ہیں۔

شاعر کے اصل محرکات زندگی کے خوب و زشت ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاعری صرف زندگی کی خوبیوں اور خامیوں تک محدود و محبوس ہو کر رہ جائے شاعر خوب سے خوب تر کی تلاش میں تو یقیناً مجو رہتا ہے لیکن بد سے بد تر کی اسے کوئی خاص جستجو نہیں رہتی بلکہ اس کی خواہش رہتی ہے کہ برائیاں دور ہوں زندگی کے خوب و زشت اسے کسی واقعہ میں بھی نظر آ سکتے ہیں یا کسی خواب و خیال میں بھی۔ اسے زندگی کی کوئی حقیقت یا افسانہ بھی متحرک کر سکتا ہے اور کوئی تصور و نظریہ بھی۔ اس کے دوسرے محرکات جذبات و محسوسات، تجربات و مشاہدات بھی ہو سکتے ہیں یہ شاعر کے ذہن کی وابستگی پہلے انھیں چیزوں سے ہوتی ہیں وابستگی کے تصور سے یا طویل غور کرنے کے بعد اس کے ذہن میں تخلیقی عمل شروع ہو جاتا ہے اور جب فیصلہ طلب مسئلہ وہ قطعی طور پر اپنے ذہن میں حل کر لیتا ہے تو اسے شعر کی ترتیب و تنظیم کی فکر ہوتی ہے۔ اس کے سامنے الفاظ و فقرات کی بہت بڑی فوج جانی پہچانی ہوتی ہے لفظی سے آگے بڑی ہوتی ہے اس میں سے وہ مناسب و موزوں الفاظ و فقرات منتخب کرتا ہے۔ وزن و قافیہ و ردیف کی اگر اسے ضرورت ہوتی ہے تو انھیں بھی منتخب کرتا ہے ورنہ ان کے انتخاب کی زحمت نہیں گوارا کرتا۔ اظہاریت کے جب یہ سارے سامان فراہم ہو جاتے ہیں تو شعر کی تشکیل و تجسیم آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اظہار کی منزل میں تھوڑی بہت کشمکش ہو نت کرنی پڑتی ہے۔ مشق و مہارت سے یہ مرحلہ بھی طے ہو جاتا ہے۔

کرامت صاحب نے تحریر کیا ہے کہ مومن کا پہلا مصرع بہت ہی روانی کے ساتھ موزوں ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسرا مصرع بھی بہت بے ساختہ ہے۔ غزل کی غزل ہی بہت اچھی ہے پوری غزل میں تکلف و تکلیف کی کوئی خاص علامت نہیں ملتی۔

اس کے بعد کرامت صاحب نے تحریر کیا ہے۔

"اس مصرع میں جو خیال پیش کیا گیا ہے وہ بہت ہی پرانا خیال ہے۔ یعنی قافیہ سوختہ ساماں نے شاعر کے تحت الشعور کے ان جذبات کو بیدار کیا جو متقدمین کے مطالعہ سے ذہن شاعر میں پہلے سے محفوظ تھے۔ عاشقوں کے مزار پر چراغ مفلس کا ٹمٹمانا ایک پرانا خیال ہے"

کرامت صاحب نے متقدمین کے اشعار پیش نہیں کیے۔ غالباً ان کے ذہن میں فارسی کا یہ شعر ہوگا:

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

قبروں پر چراغ یا شمع جلانے کا حسب دستور قدیم ساری دنیا میں رائج ہے مومن نے قبروں کے اوپر چراغ جلنے یا جلانے کا کوئی تذکرہ اپنے شعر میں نہیں کیا ہے اس نے اپنے شعر میں قبر کے اندر کی حالت کا ذکر کیا ہے کرامت صاحب کی اس آسان فہمی سے غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ موصوف نے "عاشقوں کے مزار پر چراغ مفلس کا ٹمٹمانا" تحریر کر دیا۔ قبر کے اندر کی حالت انیس کی رباعی سے واضح ہوئی۔

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا
جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہوئے گا انیس
ہم ہوئیں گے اور قبر کا کونا ہوگا

انیس کی مندرجہ بالا رباعی سے مومن کی واقفیت کوئی امر محال نہیں۔ انیس و مومن تقریباً ہم عصر تھے۔ انیس کلاسیکی شاعر

تھے اور مومن رومانٹک۔ انیس حقیقت پسند تھے اور مومن تصور پسند۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انیس کی حقیقت پسندی مومن کی تصوریت سے بالکل مختلف ہے یا مومن کی تصوریت انیس کی حقیقت پسندی سے کوئی میل نہیں کھاتی۔ دونوں میں کچھ اوصاف مشترک بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف بھی۔ میں نے ان دونوں عظیم شاعروں کے اوصاف کا اشتراک و اختلاف صرف اس لیے لکھا ہے کہ مجھے انیس کی رباعی کا موازنہ مومن کے شعر کی ماہیت سے کرنا ہے ورنہ دونوں شاعری جداگانہ ہے۔ مماثلت یا اختلاف صرف اتفاقی ہو سکتا ہے۔ دونوں مضامین نو کے انبار لگاتے رہے۔ دونوں کو خوشہ چینی سے نفرت تھی۔ ایک حزینہ کا یا ہر دوسرا تجربہ پر مائل۔ دونوں اپنے نئے نئے چراغ جلاتے رہے۔ ان چراغوں کی نوعیت بجلی کے قمقموں کی روشنی سی ہے جو قوت کے اعتبار سے بڑھتی یا گھٹتی رہتی ہے انیس نے اپنی رباعی میں ایک کھلی حقیقت نظم کی ہے جس سے قبر کی تنگی، تاریکی اور تنہائی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی۔ جو کسی حیثیت سے خوش آئند نہیں کہی جا سکتی۔ مومن کا تصور ارضیت و انسانیت اس حقیقت کے ماننے کے لیے تیار نظر نہیں آتا۔ مومن کی واقفیت ایک اور روایت سے بھی تھی۔ یعنی زمین کا بوجھ ایک گائے اپنی سینگوں پر سنبھالے ہوئے ہے اور گائے کا بوجھ ایک مچھلی کے سر ہے اس خدمت کے صلہ میں یا فطری حیثیت سے اس کے فلس میں تھوڑی سی چمک پیدا ہو گئی ہے مومن کو یہ روایت مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ البتہ حافظ کے اس شعر سے:-

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام

وہ کسی حد تک متفق نظر آتا ہے لیکن مکمل طور سے نہیں۔ وہ نئی بات کہنا چاہتا تھا یا شعر تخلیق کرنا چاہتا تھا سب سے الگ سب سے منفرد اور جس کی ہوا بھی دوسرے شاعروں کو نہ لگی ہو۔ غور و فکر کے بعد اس نے جو شعر کہا اس سے انیس کی رباعی کے موضوع کی کسی حد تک تردید ہوتی ہے اس نے مچھلی والی روایت کو بھی صحیح نہیں مانا۔ اسے محبت کرنے والوں کے ارضی رابطوں کو استوار کرنا تھا۔ ان کی برتری دکھانا مقصود تھی یہ کام گل کے نقطے سے سرانجام ہوا جو شمع سے الگ ہوتے ہی بجھ کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے۔ مومن کہتا ہے کہ محبت کے سوختہ ساماں خاک میں دفن ہونے کے بعد تاریکی و تنہائی میں نہیں رہتے بلکہ ان کی قبریں شبستاں کی سی کیفیت و حالت رہتی ہے۔ شمع کی روشنی کا یہ عالم ہے کہ اس کے "گل" میں بھی ویسی ہی چمک رہتی ہے جیسی فلس ماہی میں بتائی جاتی ہے۔ گل جو شمع سے علیحدہ ہوتے ہی بجھ جاتا ہے محبت کرنے والوں کی قبر میں چمکتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ محبت کرنے والوں سے دنیا کی رونق اور چہل پہل۔ انھیں کی ذات پر انحصار کائنات ہے۔ مچھلی کے سر انحصار ارض والی روایت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

قبر کی تنہائی اور تاریکی کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ میرے خیال میں مومن کا شعر اب واضح ہو گیا۔ مومن کے بعض شعر بعید الفہم ہوتے ہیں جو اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے جتنی آسانی سے کرامت صاحب سمجھنا چاہتے ہیں۔ پچیس سال قبل جب میں "اردو غزل کی نشو و نما" لکھ رہا تھا اس وقت میں نے مومن کے اس شعر کو بعید الفہم لکھ دیا تھا لیکن میرے خیال میں بعید الفہمی اور نازک خیالی میں تضاد محض کی سی حالت نہیں۔ بعض بعید الفہم شعر نازک و لطیف بھی ہو سکتے ہیں۔

مومن کے شعر کی نوعیت کچھ ایسی ہی ہے۔ بعید الفہم ہونے کے باوجود مومن کے فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس سے ارضی رشتے استوار ہوتے ہیں اور موت کے بعد کی زندگی خوش آئند نظر آتی ہے۔ جی چاہتا ہے جس شاعر کی ساری عمر عشق بتاں میں کٹی ہو اس کی تعریف میں حافظ کا یہ شعر لکھ دوں۔

حسن تو ہمیشہ در فزوں باد
رویت ہمہ سالہ لالہ گوں باد

قبرستان

آزاد گلاٹی

یہ قبرستان ہے! اس میں نہ جانے کتنی قبریں ہیں!!!
مگر اک قبر پہ تنہا
ہواؤں کے تھپیڑوں میں
دیا اک جھلملاتا ہے!
تمناؤں کی تربت پر
مصائب کے بگولوں میں
تمہاری یاد ہو جیسے!!!

دراڑیں

اسرار اکبرآبادی

منجمد اندھیروں میں
آج ہے نظر تنہا
دور تک ہے سناٹا
کچھ نظر نہیں آتا
گھل گیا ہے ہر منظر
رات کی سیاہی میں
دم بخود فضائیں ہیں
اونگھتی سی راہیں ہیں
کیا کروں میں گھر جا کر
گھر پہ کون بیٹھا ہے
دل میں آگ روشن ہے
تار تار جلتا ہے
خون بھی ابلتا ہے
آج خود سے گھبرا کر
جی میں ہے کہ مر جاؤں
غار میں اتر جاؤں
لیکن ایسے مرنا بھی
زندگی سے دھوکا ہے
سب سمجھ میں آتا ہے
کچھ نہیں سمجھتا ہوں
اب گھڑی کے بھاؤ میں
چپ کھڑی ہیں دیواریں
کشمکش کا عالم ہے
گیت گا نہیں سکتا
چیخ بھی نہیں سکتا
ہر طرف دراڑیں ہیں

غزلیں

علیم اللہ حالی

اور دل نے تو دل جیتا ہے طرزِ فغاں سے   اک میں ہوں کہ نکلی نہ کوئی آہ زباں سے
چند تری یاد کے ہیں سینکڑوں لیکن   وابستگی سی نہیں میرا ہمیں جاں سے
ہاں میرے لیے ہے یہی اک دولتِ جاوید   یہ درد ملا ہے جو مجھے عمرِ رواں سے
کھلتا ہے ہر قطرہ تری شکل کی صورت   چمکا ہے جو نقش میں ہمارے رگِ جاں سے
اک درد کا رشتہ ہے سو وہ بھی نہیں باقی   میں لاؤں حسرت کی کرن اور کہاں سے

تارا چرن رستوگی طاہر

ذہن و احساس میں ہم توڑتے ارمانوں کی   سرد آہوں نے بنا ڈالی سیہ خانوں کی
شعر کیا جس میں نہیں جذبہ ارمانوں کی   اشک کیا جس میں نہیں شدتیں طوفانوں کی
وسعتیں بڑھتی چلی آتی ہیں ویرانوں کی   مل گئی خاک میں عزت مرے ارمانوں کی
تھیں صنعتیں تابانی پہلے حیا بانوں کی   اب تو ناگفتہ بہ حالت ہے گلستانوں کی
آہ خالی نہ گئی سوختہ سامانوں کی   اونچی ہوتی ہی گئی آگ شبستانوں کی
امن و الفت پہ نظر ہی نہیں شیطانوں کی   دیکھئے طرزِ روش آج کے انسانوں کی
عقل و دانش کا یہی ایک ہے مصرف جیسے   رہتے ہیں اہلِ خرد گھات میں انسانوں کی
دامنِ ظلم و ستم کو بھی نہ چھوڑیں ثابت   وحشتیں آئیں تو ہوں چاک گریبانوں کی
وسعتِ قلب و نظر ندرتِ تخیل و قیاس   ان ہی سے ہوتی ہے توقیر دبستانوں کی
درد و ادبار کے تھپیڑوں سے انھیں کیا مطلب   پھانک طرزِ روش ہوتی ہے دیوانوں کی
آپ کی چشمِ عنایت سے رہا ہوں محروم   در پہ کیوں پڑتی ضرورت مجھے پیمانوں کی
دوست دشمن میں کوئی فرق نہیں اے طاہر   وائے بیگانہ روی آج کے انسانوں کی

مدحت الاختر

اپنا گھر اپنی زمیں   ساری دنیا سے حسیں
کس کو اپنی فکر ہے   ہم کو کس کا دکھ نہیں؟
قریہ قریہ دشت ہے   پانی پانی ہے زمیں
اپنا سبھی سے کہے   آئے گا کس کو یقیں
ق
چہرہ چہرہ چاند ہے   بازو بازو مرمریں
کس کو اپنا جانئے   کس پہ کر لے دل یقیں

رباب رشیدی

اٹھتے جاتے ہیں رقیبانِ ادب کیا کہئے   ڈھلتی جاتی ہے تاریکیٔ شب کیا کہئے
وہ اندھیرا ہے کہ اب دل بھی گھبراتا ہے   یہی افسردگیٔ دل کا سبب کیا کہئے
حسن کی راہ میں اب چھوٹ بجا کیا کہئے   عشق کی راہ میں مانع ہے ادب کیا کہئے
بے غرض ان سے کبھی ہے جو سرِ راہ وفا   اب وہی بات باندازِ طلب کیا کہئے
آج کل وہ بڑے مشروح ہے مائل بہ کرم   سرگزشتِ دلِ بیداد طلب کیا کہئے
دوستو بات تو کوئی نہیں ہوتی بیکار
یہ سلیقہ اگر آجائے کہ کب کیا کہئے

ڈاکٹر سید محمد عقیل

امانت کی اندر سبھا

(گذشتہ سے پیوستہ)

امانت نے اندر سبھا ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں لکھنا شروع کیا اور جب یہ جلسہ اسٹیج کے لیے تیار ہوا تو ۱۲۷۰ھ تھے جیسا کہ خود امانت نے شرح اندر سبھا میں لکھا ہے:

"غرض چودھویں تاریخ شوال کی ۱۲۶۸ھ میں اندر سبھا اس جلسے کا نام رکھ کر بجائے چار باب، چار پریاں قرار دے کر شروع کیا...... ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا۔"

واجد علی شاہ اختر کی مثنوی دریائے تعشق کا ڈرامہ، غزالہ ماہرو کے نام سے ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں لکھا گیا اور ربیع الثانی ۱۲۶۷ھ میں پہلی مرتبہ قیصر باغ میں کھیلا گیا۔ اس سے پہلے رادھا کنھیا کا رہس تیار ہوا جو بنی میں شامل ہے اور اس کے کھیلنے کے طریقوں کی تفصیلات بھی اسی کتاب میں موجود ہیں۔ یہ رہس ولی عہدی کے زمانے کا ہے جس میں کئی لاکھ روپے صرف ہوئے تھے لیکن فاضل مولف کا خیال ہے کہ امانت نے نہ کبھی ان رہسوں کو دیکھا اور نہ ان سے ان کی کوئی واقفیت تھی۔ عبارت یوں ہے۔

"واجد علی شاہ کے رہس کے جلسے جن میں رادھا کنھیا کے قصے کو بھی پیش کیا جاتا تھا امانت کی رسائی سے دور تھے"

"امانت کو رہس مبارک سے نزدیکی واقفیت نہیں تھی نہ واجد علی شاہ کے دربار سے ان کا تعلق"

اس سلسلے میں خود واجد علی شاہ اور شرر کے بیانات ملاحظہ ہوں۔

واجد علی شاہ عشق نامۂ منظوم میں فرماتے ہیں۔

اٹھاتے ہیں کیا کیا مزے سامعین — بھلا ایسے ہوتے ہیں جلسے کہیں
عجب بزم، حاصل ہے جس کا سرور — حقیقت میں آوازہ ہے دور دور
یہ سن سن کے لذت اٹھاتے ہیں لوگ — کہ مشتاق ہو ہو کے آتے ہیں لوگ
کیا ساری خلقت نے جلسہ پسند — ہوا شوق دل دیکھنے سے دو چند
ہزاروں نے کی پیروی اختیار — دیے جلسے اپنی طرح پر قرار
سب ناچ گانا، سبھی گفتگو — یہی جلسہ اب دم ہے کو بہ کو
یہاں تک کہ اطفال بھی صبح و شام — یہی کھیل اب کھیلتے ہیں مدام

اب عبدالحلیم شرر کا بیان گذشتہ لکھنؤ میں ملاحظہ ہو۔

"واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی اور رہس کے بیانات سے ماخوذ کر کے انھوں نے اپنا ایک ڈرامہ تیار کیا جس میں وہ کنھیا جی بنتے...... پھر جب قیصر باغ کے میلوں کا دروازہ عوام الناس کے لیے بھی کھل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈرامہ کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور شعرا بھی اس زمانے کے مذاق کے مطابق طبع آزمائیاں کرنے اور ڈراما لکھنے لگے۔ چنانچہ واجد علی شاہ کے شوق کے ساتھ ہی میاں امانت نے...... اندر سبھا لکھی۔[1]"

ان بیانات سے ثابت ہے کہ شاہی رہس اور میلے جب عام آدمیوں پر بند نہ تھے تو امانت پر کیوں بند ہو گئے۔ مجھے یہ ماننے میں بڑا تامل ہے کہ واجد علی شاہ اختر کی محفلیں صرف ان کے درباروالوں اور گھر والوں کے لیے تھیں میں سمجھتا ہوں کہ معززین شہر اس میں ضرور شرکت کرتے تھے اور قاعدے کے سبھی لوگ دیکھ سکتے تھے جنھیں کسی حد تک عام آدمی کہا جا سکتا ہے پھر جوگیا میلے میں تو ہر طرح کا آدمی قیصر باغ میں جاتا تھا اور کسی پر پابندی نہ تھی۔ جوگیا میلے کے ساتھ ناچ گانے کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ بادشاہ جوگی بنتے تھے اور بیگمیں جوگنیں اور انھیں جب ایک انبوہ کثیر دیکھ سکتا تھا تو رہس اور جلسوں کی اور محفلیں کیوں عام لوگوں پر بند ہوتی تھیں؟ پھر واجد علی شاہ نے عشق نامے کے اوپر لکھے ہوئے اشعار میں دیکھنے والوں کی کوئی تخصیص نہیں کی: "دور دور سے لوگ مشتاق ہو کے آتے ہیں، ساری خلقت یہ جلسہ پسند کرتی ہے، پھر واپس جا کر اسی طرز پر رہس اور جلسہ بناتی ہے" جیسی عبارت صاف بتاتی ہے کہ لکھنؤ میں اگر کسی نے واجد علی شاہ کے بعد جلسہ ترتیب دیا تو وہ امانت ہی تھے۔ ایسی صورت میں

ہزاروں نے کی پیروی اختیار — دیے جلسے اپنی طرح پر قرار

کا اور کیا مطلب لگایا جا سکتا ہے؟ ہاں اگر کسی کو یہ شبہ یا انکار ہے کہ قیصر باغ کی محفلوں میں عام آدمی آ جا سکتا ہی نہیں تھا تو اس کے لیے یہ سطریں پیش کی جاتی ہیں۔

"بادشاہ ہونے کے بعد بھی چند سال تک یہ جلسہ (جوگی بننے کی رسم کا جلسہ) اسی طرح ایک نجی صحبت کی صورت میں ہوتا رہا۔ ۱۲۶۹ھ میں واجد علی شاہ نے اس کو ایک میلے کی شکل دے کر سارے شہر کو اس میں شرکت کی دعوت دی یہ میلا قیصر باغ میں ساون کے مہینے میں ہوتا تھا...... اور چونکہ ناچ گانے کی محفلیں اس میلے کی خاص خصوصیت تھی اس لیے اس کو ساون کا جلسہ کہتے تھے۔[2]"

"جتنی خلقت باغ میں آئی سب کے کپڑے شنگرفی تھے...... حضرت قدرت قدر نے بھی شنگرفی پوشاک پہنی تھی اور کثرت خلق کی اس قدر تھی کہ خود مولف نے دیکھا تھا کہ جب دروازہ قیصر باغ کے ہوادار مولف کا پہنچا تو چوب داروں نے...... بھیڑ کو ہٹایا [illegible] اس قدر دروازے میں خلقت کی بھیڑ تھی کہ کئی سے جو خلق کا رہ گیا تھا اور بھیڑ ہٹ نہ سکی تھی اور باغ اندر کا تو حساب ہی نہیں۔[3]"

---

[1] گذشتہ لکھنؤ مطبوعہ نسیم بک ڈپو صفحہ ۱۰۱
[2] لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ص ۲۵
[3] تاریخ اودھ [illegible] ص ۱۸۱ بحوالہ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج

۱؎ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ص ۱۲۰

یہی بیان تقریباً عبدالحلیم شرر کے گذشتہ لکھنؤ میں بھی صفحہ پر دیکھا جاسکتا ہے۔ خود واجد علی شاہ نے بھی عشق نامہ میں اپنے جوگی بننے اور بیگموں کے جوگن بننے کا حال لکھا ہے[۱]۔

سنو اک ذرا بے وفاؤں کا حال — کہ بنتا ہوں جوگی میں ہر ایک سال
مری بیگموں سے بھی دو تین چار — بنی جوگنیں بنتی ہیں گل عذار

اس کے علاوہ ہادی علی بیجود کی مثنوی جلوۂ اختر جوان کے کلیات گلستان بےخزاں میں شامل ہے اس میں اس میلے کا تفصیلی حال دیکھا جاسکتا ہے۔ سرور کے فسانۂ عبرت مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی میں صفحہ ۱۲۰-۱۲۱ پر بھی یہی تذکرہ ہے۔ اب اس سلسلے کی آخری کڑی خود امانت کا بیان واجد علی شاہ کے رہسوں کے متعلق ہے جو بہت اہم ہے

"مصلّی علی کیا رہس مبارک طبع سلیمان جاہ سے ایجاد فرمایا کہ پریوں کا ہوش اڑایا...... پریاں بن بن کر محفل میں آتی ہیں حضرت کی چیزیں گاتی ہیں، رقص کا انداز دکھاتی ہیں... ...... پریوں کا عجب انداز ہے کہ ادا کو جن پر ناز ہے... رنگ سیم تنوں کے گرمیِ صحبت سے کندن کے مانند دمکتے ہیں ....حلقہ سونے کا زلف کے بالوں میں تلوار کے مانند کستا ہے...... گلے میں ہر ایک کے وہ جڑاؤ طوق ہے جس کو ماہ پر فوق ہے۔ پوشاک میں...... بیل، گوکھرو، چکی، کرن کی وہ بوچھار ہے کہ نازنینوں کو پوشاک کا بوجھ سنبھالنا دشوار ...... شرح وہ پڑے بھاری، محفل میں تنتا ہے شفق کا حجاب بنتا ہے..... زہرہ خصال، مشتری جمال، کس پھرتی سے ناچ ناچ کر اس کے تلے سے نکل جاتے ہیں...... مثنوی حضرت کی پڑھی جاتی ہے میر حسن کی روح تازگی پاتی ہے۔ سازوں کی آواز ناچ سے مل کر دل توڑے لیتی ہے، کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔"

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تفصیلات بغیر ذاتی مشاہدہ کے کیونکر ممکن ہو سکتی ہیں خط کشیدہ سطریں بغیر آنکھوں دیکھے لکھی جا ہی نہیں سکتیں۔ اس پر یہ کہنا کہ واجد علی شاہ کے رہس امانت کی رسائی سے دور تھے کیا معنی رکھتا ہے؟ ہاں اس پر ضرور غور کرنا چاہیئے امانت نے کس رہس کا چربہ اڑایا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کا خیال ہے کہ امانت نے صرف دوسرا جلسہ دیکھا تھا گو انھوں نے 'دیکھا' کا لفظ استعمال نہیں کیا مگر ان کی عبارت

"اس سے پہلے جو رہس کا جلسہ تیار ہوا تھا اس میں افتخار الدولہ کے بیان کے مطابق صرف خاندان شاہی کے وہ افراد اور شاہزادے شرکت کرتے تھے جن کو بادشاہ خاص طور پر بلواتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ہم عصر مصنفوں میں سرور ناسخ، صغیر، امانت دوسرے جلسے کی تفصیلات سے واقف تھے[۱]۔"

سے یہی مستنبط ہے گویا مسعود صاحب کے قیاس کے مطابق امانت نے فسانۂ عشق کا رہس دیکھا تھا، غزالہ ماہرو کا نہیں اور اس کی وجہ موصوف یہ بتاتے ہیں کہ صرف فسانۂ عشق ہی ایسی مثنوی ہے جو میر حسن کی بحر میں لکھی گئی ہے۔

یہ بالکل درست ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ امانت نے غزالہ ماہرو ہی کا اتباع اندر سبھا میں کیا اور یہی رہس اندر سبھا سے نزدیک ہے لعل پری، سبز پری، نیلم پری، ماہ رو کے کنوئیں میں قید ہونے، لال پری کے اتفاقیہ تخت پر سیر کی داستانیں غزالہ ماہرو ہی میں ہیں جبکہ افسانۂ عشق میں یہ سب کچھ نہیں ہے۔ غزالہ ماہرو کی پریوں کو جب امانت کے اس بیان سے متماثل کیا جاتا ہے کہ

"مصلّی علی کیا رہس مبارک طبع سلیمان جاہ سے ایجاد فرمایا کہ پریوں کا ہوش اڑایا اور راجہ اندر کے اکھاڑے پر حرف آیا...... پریاں بن بن کر محفل میں آتی ہیں...... پریوں کا عجب انداز ہے۔ جواہر نگار سب کے پر ہیں، پوشاک میں پریوں کی وہ تیاری ہے کہ ستاروں پر رشک سے رات بھاری ہے"

تو یہ تفصیلات غزالہ ماہرو ہی کی زیادہ سمجھ میں آتی ہیں۔ افسانۂ عشق میں نہ اتنی پریاں ہیں اور نہ یہ کیفیت ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا نامناسب نہیں کہ امانت نے غزالہ ماہرو کا رہس دیکھا ضرور تھا۔ اس کے علاوہ ہادی علی بیجود کا ایک قصیدہ بھی کچھ اتفاقی اشارے اسی طرح کے کرتا ہے ۱۲۶۹ھ میں جب بیجود نے مثنوی جلوۂ اختر لکھی تو اس سے پہلے قصیدے بھی انھوں نے لکھے جو ان کے کلیات بہار بےخزاں میں مثنوی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کے ایک قصیدے میں واجد علی شاہ کے رہسوں کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تمہید اور اشعار یوں ہیں۔

"بیان جودت طبع و ایجاد جدید رہس

رہس ایجاد کئے آپ نے اس خوبی کے — طبع عالی پہ ہوئی روح کنھیا کی نثار
چار گلدستے ہیں چمک کے فروزاں اس طرح — سامنے جن کے ہوئی جاتی ہے گل شمع بہار
واہ کیا نور کا عالم ہے رہس کنڈل کا — ہالۂ ماہ کو کرتا ہے فلک جس پہ نثار
کشتیِ مہ کا ہے نقشہ کہ رہس نیا کا — نشہ ہو جائے اگر دیکھ لے زاہد اک بار
نقشہ جب کھینچ کے دکھلایا رہس گوکل کا — منہ چھپانے لگی خجلت سے عروس گلزار
یاسمن زار نظر آتا ہے باغ عالم — طائفے ناچنے لگتے ہیں یہیں کر جب یار
گنجے میں دیکھ کے گلدستوں کا جوبن بلبل — بے خزاں گلشن عالم میں انھیں کی ہے بہار[۲]"

۱۔ محل خانۂ شاہی ایڈیشن ۱۹۰۰ء کے صفحہ ۸۸ پر بیان تماشی کے تحت یہ بات صرف جوگی اور جوگن کا لکھا ہے سرخی یوں ہے "ہمیرے جوگی اور دستور خاص نواب سکندر صاحب کے جوگن ہونے کی تیاری" اس میں تفصیل ملاحظہ کی جاسکتی ہے میلہ کا حال اسی محل خانۂ شاہی کے بیان ترانوے میں شامل ہے سرخی یہ ہے "وارد منزل سے جو خانہ تک صنعت میلہ" اس میں سب طرح کے آدمی تمثیل نظر آتے ہیں یہ میلہ جوگیا میلے سے مختلف ہے۔ ۲۔ شرح اندر سبھا

۱۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج صفحہ ۱۲۱

۲۔ گلزار بے خزاں صفحہ ۱۲۳ مطبوعہ مطبع گلزار محمدی لکھنؤ ۱۲۹۰ھ

اس قصیدے میں رہسوں کے کئی ناموں کے علاوہ جنھیں سرخی میں جدید رہس کہا گیا ہے، ایک دلچسپ اشارہ بھی ملتا ہے۔ واجد علی شاہ کے رہسوں میں پہلے آگے آگے چار گلدستے نکلتے تھے۔ ان کا تفصیلی تذکرہ تاریخ اقتدار یہ میں بھی موجود ہے۔ اسے امانت نے شرح اندر سبھا میں یوں بیان کیا ہے۔

"حسینوں کو ناچ، توڑوں کا تار، سونے چاندی کے گھنگھرو کی جھنکار، پریوں کو، ننھے ہاتھ لاکر ہاز مہتاب کی صورت بناکر گلدستے لیے ہوئے۔ یہ عجب لطف دکھاتے ہیں کہ پرستان کا سماں چشم فلک کو بھول جاتا ہے۔"

زیر تبصرہ کتاب میں ایک جگہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ واجد علی شاہ کے رہس کے جلسوں میں حصہ لینے والی عورتوں کو پریوں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اس لیے ان کی رعایت سے امانت کا ذہن راجہ اندر کے اکھاڑے کی طرف گیا ورنہ ان رہسوں میں راجہ اندر سے متعلق کوئی کردار نہیں تھا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ واجد علی شاہ کے ڈراموں میں راجہ اندر کا کوئی کردار نہیں ہاں شاہ جن اور پریوں کے بادشاہ کا ذکر ضرور ہے[1] لیکن اندر سبھا اور اندر کے اکھاڑے کی روایتیں اتنی عام تھیں کہ انھیں امانت کی ایجاد سمجھنا مناسب نہیں۔ محمد قلی قطب سے لے کر ناسخ تک اور ان کے بعد بھی سیکڑوں اشعار موجود ہیں جن میں راجہ اندر اور ان کے اکھاڑے کا تذکرہ ہے۔ پھر دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم میں پوری اندر سبھا پیش کر دی تھی۔ امانت کی ذہنی اپج کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ نہ اندر سبھا کا نام امانت کا ایجاد کیا ہوا ہے اور نہ سبھا اشخاص کے امانت کی اندر سبھا میں کوئی بھی چیز ان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ تاج الملوک کا پکھاوجی بن کر اندر سبھا میں جانا اور اپنی ضد کی سزا پانا، گلفام کا کوٹھے پر سونا اور سبز پری کا اسے اٹھوا منگانا، جوگن بن کر گلفام کو تلاش کرنا، گلفام کا میر حسن کے بے نظیر کی طرح کنوئیں میں قید ہونا، یہ سب امانت کی تخلیقی چیزیں کیونکر ہو سکیں۔ یہی قصہ سحرالبیان میں ہے یہی کہانی نوطرز مرصع میں ہے اور اندر سبھا کا بنیادی واقعہ یعنی پری کا انسان سے محبت کرنے اور راجہ اندر کے دربار میں انسان کو لے جانے کے جرم میں سزا پانا، گلزار نسیم کا ٹکڑا ہے۔ اسٹیج کی روایتیں واجد علی شاہ کی ہیں۔ شعر و سخن کے میدان میں بھی امانت نے جو شہرت پائی وہ اپنی واسوخت کی وجہ سے۔ انھوں نے مرثیے بھی لکھے اور غزلیں اگرچہ بے شمار کہیں لیکن کسی ادبی تاریخ میں اگر کہیں امانت کا نام آیا ہے تو صرف واسوخت نگار کی حیثیت سے۔ اس وقت ان کی اندر سبھا کو لوگوں نے معمولی تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن بعد کو جب ہندوستان میں انگریزوں کے اثر سے تھیٹر اور ڈراموں کا شوق تیزی سے پھیلنے لگا تو اندر سبھا کو بھی لوگوں نے کھیلنا شروع کیا۔ واجد علی شاہ کے رہسوں کو عمومیت حاصل نہ ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان میں دلچسپی کم تھی بلکہ اصل سبب یہ تھا کہ جس کھیل کے تیار کرنے میں کئی لاکھ کا صرفہ ہو وہ ہر عام و خاص منڈلی یا رہس منڈلی کے بس کا کام نہیں۔ لباس، زیورات، اسٹیج کی تزئین میں جو اخراجات شاہی رہس خانوں میں ہوتے تھے، امانت بیچارے اور لکھنؤ کے عام آدمی انھیں کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ اس لیے امانت کی اندر سبھا کو عمومیت حاصل ہو گئی کہ اس کا کھیلنا آسان تھا۔

میرا خیال ہے کہ مولف نے یہ کام قدرے عجلت میں کیا اور اوپر لکھے ہوئے امکانات پر غور نہیں کیا۔ ان کی عجلت اس سے بھی ظاہر ہے کہ مقدمہ کی عبارت میں جابجا تضاد بھی موجود ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"امانت نے رہس مبارک کی شہرت، اس کے ناچ گانوں کے چرچے اور اپنے عہد کے تفریحی تصورات اور رجحانات کو مد نظر رکھ کر اپنی تخلیقی قوت سے ایک جلسہ ترتیب دیا۔"[1]

پھر صفحہ ۲۶ پر لکھتے ہیں

"امانت کے سامنے نہ کسی زبان کا ڈرامہ تھا اور نہ ان کے پاس ایسے ذرائع ہی تھے کہ وہ ڈرامے یا تھیٹر کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکتے۔"

"ہر شعبے میں مروجہ انداز سے علاحدگی اس دور کے لکھنؤ کی خاصیت ہے اور اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ زوال کے بھنور میں پڑے ہونے کے باوجود اس میں نئی چیزوں کو قبول کرنے اور دھارے کو پلٹنے کی خواہش ضرور موجود ہے جو ایک صحت مند اور قوی سماج کی نشانی ہے ذہنی بیداری اور وسعت قلب کی علامت۔" (ص ۔۔)

پھر ص ۲۲ پر لکھتے ہیں

"راجہ اندر کا حکم اور اس کی مرضی اصل میں روایت کی حفاظت اور ایک ساکت سماج کی جامد قدروں کا دوسرا نام ہے۔"

اس سے قطع نظر کہ یہ ساکت سماج اور جامد قدریں ہندو دیومالا کے دور سے شروع ہو کر لکھنؤ کے انتزاع تک چلتی ہیں، کیونکہ راجہ اندر کا اکھاڑا لکھنؤ کے ذہن کی پیداوار نہیں، یا اس دور میں تھیں جب راجہ اندر کے ایسے حکم کی کڑی شقے میں شامل ہوتی ہوگی اور جس کا کسی کو پتہ نہیں اوپر کا تضاد محل نظر ہے۔ اسی طرح فاضل مولف نے اندر سبھا کے متن میں جابجا کچھ عبارتیں اپنی طرف سے بڑھا دی ہیں۔

"پردے کے پیچھے سے ٹھہر ٹھہر کر گھنگھرو کی آوازیں، سارنگی اور چکارے کی آوازوں کے ساتھ آمد گائی جاتی ہے۔"

اس طرح کی عبارتیں اندر سبھا کے کسی مستند نسخے میں نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شرح اندر سبھا کے اشارے متن میں شامل کر کے مولف نے خاص خاص موقعوں کی طرف توجہ دلائی ہو، مگر اس کے لیے بہتر ہوتا اگر فٹ نوٹ میں وضاحت کر دی جاتی۔

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

۱۔ مثنوی بحر الفت میں پریوں کے بادشاہ کی بیٹی زہرہ پری بتائی جاتی ہے۔

۱۔ مقدمہ اندر سبھا ص۱۔ مسعود حسن رضوی صاحب نے اندر سبھا کا دیباچہ لکھتے ہوئے ص ۔۔ پر لکھا ہے انھوں نے (امانت نے) اپنے شاگرد اول مرزا عابد علی عبادت کی فرمائش سے اندر سبھا تصنیف کی۔ یہ رہس جس کو امانت نے اپنے پیش نظر نمونہ بنایا یقیناً لکھنؤ کا وہی شاہی رہس تھا جس کا تفصیلی بیان انھوں نے شرح اندر سبھا میں لکھا ہے۔

مراسلات

غالب سے منسوب ایک شعر کے بارے میں

'ہماری زبان' ۲۲ ستمبر ۶۶ء میں جناب سید نجم الحسن صاحب ادیب نے لکھا ہے۔ کہ

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

غالب کا شعر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ نسخہ حمیدیہ اور شرح دیوان غالب (از حسرت موہانی) میں نہیں ملتا۔ مگر دیوان غالب (مرتبہ مالک رام مطبوعہ آزاد کتاب گھر دہلی) کے صفحہ ۳۲۲ پر فردیات کے تحت اور دیوان غالب (مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس) صفحہ ۲۳۱ پر متفرق اشعار کے تحت یہ شعر ملتا ہے۔

جناب انجم صاحب نے دریافت کیا ہے۔ کہ یہ شعر کس کا ہے؟ ناظرین کرام کی دلچسپی کی خاطر غالب کے اس شعر کے متعلق اردوئے معلٰے ستمبر ۱۹۱۰ء نمبر ۹ جلد ۱۱ سے شوکت بلگرامی کی تحریر نقل کی جاتی ہے۔

"اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ دقت پسند طبائع مضمون کی تلاش میں کوسوں نکل جاتے ہیں اور سامنے کی باتیں ان کو نہیں سوجھتیں۔ اگرچہ دیکھا جائے تو دلنشیں وہی باتیں ہوتی ہیں۔ جو دن رات ہم پر گذرتی ہیں اور یہی شعر کی اصل غایت ہے کہ وہ دلنشین ہو۔ چنانچہ قدر مرحوم کہتے ہیں۔

ہم تو اسی شعر کو کہتے ہیں شعر
منہ سے وہ نکلا کہ اثر ہو گیا

یہ بات (یعنی کلام میں اثر) یا تو شعرائے متقدمین کے کلام میں دیکھی گئی ہے یا دور آخر کے سرتاج میرزا غالب کے کلام میں پائی جاتی ہے اور یہی خصوصیت ہے جس نے ان کے کلام کو اوروں سے ممتاز بنا دیا ہے۔ چنانچہ ان کا مطبوعہ دیوان ہمارے اس دعوے کا شاہد ناطق ہے۔

میرزا کی ایک مشہور غزل ہے۔

قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

بعد طبع دیوان، اسی زمین میں میرزا نے ایک اور شعر کہا تھا جس نے اپنے ایک بزرگ سے سنا ہے۔ چونکہ یہ شعر دیوان میں نہیں ہے۔ اس لیے نذر ناظرین کرتا ہوں۔

دیکھئے غالب مرحوم نے اپنی انتہائی حسن پرستی اور انتہا کی بے سروسامانی کو کس انداز سے بیان کیا ہے اور کیا خوب کہا ہے۔

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

شوکت بلگرامی نے جس بزرگ سے یہ شعر سنا۔ ان کا نام نہیں لکھا۔ ورنہ غالب سے ان کے تعلقات کا بھی اندازہ ہو جاتا۔

(فرید)

(نظامی بدایونی نے سب سے پہلے اس شعر کو نظامی پریس بدایوں سے شایع ہونے والے اس دیوان غالب میں درج کیا تھا جس پر ڈاکٹر سید محمود کا مقدمہ تھا ابھی تک کوئی قطعی ثبوت اس بات کا نہیں ملا کہ یہ شعر غالب کا ہے لیکن ان کا ہو سکتا ہے)

(ادارہ ہماری زبان)

انجمن ترقی اردو پنجاب کا گشتی مراسلہ

صوبائی انجمن کے تمام عہدیداران اراکین اور ضلع آرگنائزرز کے نام

امید ہے کہ آپ انجمن کے لکھنؤ میں منعقدہ اجلاس کے فیصلوں کی روشنی میں اپنی تنظیم کو مضبوط موثر اور ہر دلعزیز بنانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہوں گے اور یقیناً آپ آئندہ اجلاس کے موقعہ پر خاطر خواہ کامیابیوں کا مژدہ لے کر شرکت فرمائیں گے۔

لکھنؤ میں فیصلہ کے مطابق انجمن کا صوبائی دفتر چنڈی گڑھ میں کھول دیا گیا ہے۔ آئندہ اطلاع تک آپ خاکسار کے نام مندرجہ بالا پتہ پر خط و کتابت فرمائیں۔

صوبائی دفتر کی مالی امداد کے لیے امکان بھر کوششیں آپ کا فرض ہے۔ آپ اس مد میں جتنی رقم جمع کر سکیں، بلا تاخیر ارسال فرمائیں اور آئندہ اجلاس تک اس مد میں جمع ہو سکنے والی رقم کے اندازہ سے فوری اطلاع دیں۔

فارم رکنیت سازی چھپ چکے ہیں۔ فی رکن تین پرت کے حساب سے ہیں ممبروں کے واسطے ۲۰ فارموں پر مشتمل کاپیاں بنوائی گئی ہیں۔ ایک سو ممبر بنانے کے لیے ایسی پانچ کاپیاں درکار ہوں گی جو صوبائی دفتر سوا روپیہ میں قیمتاً مہیا کرے گا۔ جس قدر فارم آپ کو مطلوب ہوں۔ فوراً اطلاع دیں۔ ممبر سازی کے قواعد ہمراہ ارسال کیے جائیں گے۔

لکھنؤ اجلاس کی مفصل [illegible] ایک مطبوعہ کتابچہ کی شکل میں ارسال کی جا رہی ہے۔ مطالعہ کے بعد اپنی قیمتی رائے سے جلد مطلع فرمائیں۔

انجمن کا آئندہ اجلاس نومبر میں منعقد ہو گا۔ آپ کو کم و بیش ایک ہفتہ قبل اجلاس کی تاریخ، مقام اور وقت سے باقاعدہ مطلع کیا جائے گا۔

اپنی سرگرمیوں سے باقاعدہ مطلع فرماتے رہیں۔

(سورج نرائن جنرل سکریٹری)

ہماری زبان سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری کا نمبر ضرور دیجئے

بھاگلپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے وفد کی ملاقات

اردو کی سہولتوں کے متعلق انجمن ترقی اردو کا میمورنڈم

بھاگلپور۔ انجمن ترقی اردو شاخ بھاگلپور کے صدر جناب ڈاکٹر محمد یونس ایم۔ بی۔ بی۔ ایس نے یہ اطلاع دی ہے کہ یکم نومبر ۱۹۶۶ء کو انجمن کا ایک وفد وائس چانسلر بھاگلپور یونیورسٹی سے ملاقات کر رہا ہے اس سلسلے میں انجمن نے یونیورسٹی میں اردو کی اعلیٰ تعلیم نیز دیگر سہولتوں کے بارے میں ایک میمورنڈم تیار کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یونیورسٹی میں اب تک اردو کی اعلیٰ اور مناسب تعلیم کا معقول انتظام نہیں ہے جس سے اردو حلقہ میں بڑی بے چینی پائی جاتی ہے۔ خبر ہے کہ صدر انجمن ترقی اردو بہار نے شاخ بھاگلپور کو اس باب میں ضروری ہدایات دے دی ہیں۔

(منظم)

مگدھ یونیورسٹی میں اردو ایم اے کلاس

کھلوانے کی جد وجہد

گیا ۲۴ر اکتوبر۔ جناب کلام حیدری صدر انجمن ترقی اردو گیا نے ایک خصوصی انٹرویو میں بتایا کہ اردو کا معاملہ اب اس منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں اردو دوستوں کی مسلسل جد وجہد اور قربانیوں کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے۔

اس سوال پر کہ آخر مگدھ یونیورسٹی اردو میں ایم۔ اے کا سلسلہ شروع کرنے میں تاخیر کیوں کر رہی ہے جب کہ دوسرے کئی سبجکٹ میں ایم۔ اے کا نظم اسی سال سے ہو چکا ہے۔ جناب حیدری صاحب نے فرمایا کہ مگدھ یونیورسٹی میں اردو میں ایم۔ اے کا نظم تو ہونا ہی ہے کسی تجویز کے پیش ہونے کے بعد اسے عملی جامہ پہننے کے لیے کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کی تجویز کو یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل، فنانس کمیٹی، سینٹ اور سنڈیکیٹ کی منظوری کے بعد ہی عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے اسی سلسلے میں ہماری کوششیں اور جد وجہد جاری ہیں۔

(آدرش)

پروفیسر احتشام حسین کی تقریر

۱۷ر اکتوبر ۶۶ء۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب کی آمد کے سلسلے میں اسلامیہ کریمیہ ڈگری کالج کی جانب سے ایک جلسے کا انعقاد بتاریخ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۶ء کو ہوا جس میں کالج کے طلبہ اساتذہ اور کالج کی مجلس انتظامیہ کے اراکین کے علاوہ شہر کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے شرکت فرمائی۔

جلسے کا آغاز جناب عادل جعفری کی تعارفی نظم سے ہوا جس میں احتشام صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

صدر شعبۂ اردو جناب شمیم حنفی نے احتشام صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے موصوف کے ادبی نظریات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی آمد پر فخر و مسرت کا اظہار کیا۔ شمیم صاحب نے فرمایا کہ احتشام صاحب ہمارے ان ادیبوں کی فہرست میں نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے ہیں جنھوں نے زبان و ادب کے سماجی نظام کو سمجھنے اور سمجھانے میں بے حد اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

شمیم صاحب کی تقریر کے بعد مجلس انتظامیہ کے صدر جناب خورشید حسن خاں صاحب اور نائب صدر جناب محمد احمد خاں صاحب اور اندور شہر کے ادبی و تہذیبی اداروں کی جانب سے احتشام صاحب کی گل پوشی کی گئی۔

"اردو ادب میں قومی یکجہتی کے عناصر کا جائزہ لیتے ہوئے احتشام حسین صاحب نے فرمایا کہ اردو زبان کی تعمیر اور تشکیل ہی اس جذبۂ ہم آہنگی کا روشن ثبوت ہے جو ہندوستان کے مختلف مذاہب اقوام اور افراد کے درمیان خلوص، محبت اور ہمدردی کے رشتوں سے عبارت ہے اردو ادب کے مختلف ادوار کا احاطہ کرتے ہوئے احتشام صاحب نے فرمایا کہ ہماری ادبی تاریخ میں امیر خسرو سے لے کر آج تک کم و بیش تمام اہم اور ممتاز شعراء ادباء نے اپنے طور پر انسان دوستی وسیع القلبی اور روشن خیالی کی اس روایت کو زندہ رکھا ہے جو قومی یکجہتی سے عبارت ہے اور جسے مختلف حالات و عوامل نے آج کی زندگی کا ایک اہم مسئلہ بنا دیا ہے۔

صدر جلسہ جناب ڈاکٹر انور علی صاحب پرنسپل کالج نے موصوف کا شکریہ ادا کیا۔

(واحق اندوری۔ سکریٹری بزم ادب اندور)

انجمن ترقی اردو شاخ ناندیڑ کا قیام اور الحاق

مہاراشٹر کے اردو دوستوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایک شاخ ناندیڑ میں قائم ہوگئی ہے اور اس کا باقاعدہ الحاق ریاستی شاخ مہاراشٹر سے ہوگیا ہے ناندیڑ کے اردو دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ ناندیڑ کے ممبر بن کر اردو کے مقاصد کو تقویت پہنچائیں۔

رکن سازی کے فارم حاصل کرنے کا پتہ۔

جناب محمود عشقی صاحب سکریٹری

انجمن ترقی اردو ہند شاخ ناندیڑ وزیرآباد۔ ناندیڑ (دکن ریلوے)

(م۔ ی کھتری شعبۂ نشر و اشاعت انجمن ترقی اردو (ہند) مہاراشٹر)

شاخ جبل پور کا طرحی مشاعرہ

انجمن ترقی اردو جبل پور کے زیر اہتمام حسب معمول طرحی مشاعرہ بمقام جہانگیر آباد منزل زیر صدارت جے کرشن چودھری حبیب سابق کمشنر و صدر انجمن منعقد ہوا شعرا حضرات نے مندرجہ ذیل طرحوں پر طبع آزمائی فرمائی۔

(۱) جو کل نظر آئی تصویر نظر آئی ۔ (۲) کیا کریں ترک ملاقات کی بات

مشاعرہ ۱۲ بجے شب تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ (ناظم شعبۂ نشر و اشاعت)

اردو تعلیم میں رکاوٹیں دور کرنے کے لیے ضروری اقدامات

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کا مراسلہ انجمن ترقی اردو کے نام

حیدرآباد ۵ ار اکتوبر معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے حسب ذیل پریس نوٹ جاری کیا ہے: سال گذشتہ دسمبر کے مہینے میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے صدور و معتمدین اور دوسرے کارکنوں کا دو روزہ اجتماع ہوا تھا جس میں ساری ریاست سے ایک سو سے زیادہ نمائندوں نے شرکت کی تھی اور اردو سے متعلقہ مسائل پر تفصیلی غور و خوص کے بعد چند قراردادیں منظور کی تھیں۔

ان میں سے ایک قرارداد میں اردو تعلیم کی غیر اطمینان بخش حالت پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے چند مطالبات کئے گئے تھے اس سلسلہ میں کمشنر موصوف کا حسب ذیل جواب موصول ہوا ہے۔

۱۔ اردو کی متوازی جماعتیں کھولنے میں جو غیر معمولی تاخیر ہوتی ہے اسے دور کرنے کے لیے ایسی جماعتیں کھولنے کا اختیار ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر کو دیا گیا ہے۔

۲۔ نئی جماعتیں کھولنے کے لیے جو کمی یا دوسرے مطالبات کئے جاتے ہیں وہ سب کے لیے یکساں ہیں۔ طلبہ کی غیر معمولی تعداد کے باعث حکومت صرف سالانہ متوالی اخراجات برداشت کر سکتی ہے جہاں تک غیر متوالی اخراجات (مثلاً کافی جگہ اور تعلیمی ساز و سامان کی فراہمی) کا تعلق ہے اس کا بار غیر سرکاری سکنڈری مدارس ہی خود ان اداروں کو برداشت کرنا پڑتا ہے جو ایسی جماعتیں کھلوانا چاہتی ہوں، خواہ وہ ضلع پریشد ہوں یا بلدیات یا خانگی ادارے۔

۳۔ نئی جماعتیں کھلنے کے بعد اساتذہ کے تقرر میں تاخیر ہوتی ہے اسے دور کرنے کے لیے ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسرس کو اب ۱۳۰ تا ۲۵۰ روپے یا اس سے کم ماہوار کی جگہوں پر تقرر کا اختیار دیا گیا ہے اور انہیں ہدایات جاری کی جا رہی ہیں کہ وہ ایسے مدارس میں تقرر طلب جگہوں کو جلد پر کریں۔

۴۔ جہاں تک اردو اساتذہ کی ٹریننگ کا تعلق ہے ریاستی حکومت حال حال کے دوران میں اس مسئلہ کا جائزہ لینے والی ہے۔

۵۔ اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس یا اردو متوازی جماعتوں کے معائنہ کے لیے حسب ذیل اضلاع میں ڈپٹی انسپکٹروں اور جونیئر ڈپٹی انسپکٹر کا تقرر کیا گیا ہے۔

وشاکھاپٹنم اور سری کاکلم کے لیے	ایک
دونوں گوداوری اضلاع کے لیے	ایک
کرشنا، نیلور، اننت پور، چتور ہر ایک کے لیے	ایک
گنٹور، کرنول، کڑپہ ہر ایک کے لیے	"

تلنگانہ میں معائنہ کرنے والے اکثر عہدہ دار اردو جاننے والے ہوتے ہیں اس لیے یہاں اردو اسکولوں کے معائنہ کے لیے علیحدہ خصوصی عملہ مہیا نہیں کیا گیا ہے۔

۶۔ جہاں تک اردو نصابی کتابوں کا تعلق ہے تیسرے تا ساتویں درجوں کے لیے ریاضی اور چوتھے تا ساتویں درجہ کے لیے سوشیل اسٹڈیز کے مضامین نصابی کتابوں کو مہیا نے کی اسکیم میں شامل کئے جا چکے ہیں جونہی انگریزی کا مسودہ تیار ہو جائے چوتھے تا ساتویں درجوں کے لیے جنرل سائنس کا مضمون بھی اس اسکیم کے تحت آجائے گا۔ (سری نواس لاہوٹی)

پروفیسر اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کے اعزاز میں

انجمن اردوئے معلیٰ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک جلسہ

۳۱ر اکتوبر ۱۹۶۶ء کو انجمن اردوئے معلیٰ علی گڑھ کا ایک جلسہ پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں ہوا۔

یہ جلسہ پروفیسر اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کے اعزاز میں کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کی ادبی خدمات بالخصوص افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کے کارناموں کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد شکیلہ اختر نے اپنا ایک افسانہ پڑھ کر سنایا جس کا عنوان "چنا" ہے۔ یہ افسانہ سیتی ڈریم کی فضا کی عکاسی کرتا ہے اور اس کے گرد اروں میں زندگی سے محبت اور انسانی رشتوں کی لطافت و نزاکت کا عجیب و غریب احساس ملتا ہے۔ یہ افسانہ حاضرین جلسہ نے بہت پسند کیا۔ جناب صدر کی درخواست پر پروفیسر اختر اورینوی نے افسانہ نگاری کے جدید میلانات پر ایک تقریر کی۔ موصوف نے ۱۹۲۶ء سے لے کر اب تک کی افسانہ نگاری کا مختصر طور پر جائزہ لیتے ہوئے اسے چار بڑے رجحانوں میں تقسیم کیا۔ ان کے نزدیک ترقی پسند تحریک سے قبل دو اہم رجحانات ملتے ہیں ایک رومانیت کا ہے جس کی نمائندگی نیاز، مجنوں اور حجاب، امتیاز علی وغیرہ کرتے ہیں دوسرا رجحان حقیقت پسندی کا ہے جس کے نمائندہ پریم چند ہیں۔ پریم چند کی حقیقت پسندی کا اعتراف کرتے ہوئے اختر صاحب نے ان کی فنی کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند کی تاریخی اہمیت بہت ہے لیکن وہ بڑے فنکار نہ تھے۔ ان کا فن پاکیزہ نہیں۔ ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہمارے یہاں افسانہ نگاری کا جو دور شروع ہوتا ہے اسے اختر صاحب نے افسانہ نگاری کے دور زریں سے تعبیر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس دور میں اردو افسانے میں وسعت گہرائی اور فنی بلندی آئی۔ تکنیک اور ہیئت کے بے حد اہم تجربے کیے گئے اگرچہ بعض افسانہ نگاروں کے یہاں مقصدیت اور تبلیغ اور شاعرانہ و خطیبانہ انداز کا غلبہ رہا ہے لیکن اس دور میں منٹو اور بیدی جیسے اعلیٰ درجے کے فنکار پیدا ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میں منٹو کو اس دور کا سب سے بڑا فنکار سمجھتا ہوں۔

اختر صاحب نے آگے چل کر فرمایا کہ ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں کے مدھم پڑ جانے کے بعد ادھر دس پندرہ برسوں میں اردو افسانے کی ترقی کچھ رک سی گئی ہے۔ ایک آدھ افسانہ نگار ایسا کھائی دیتا ہے جس سے ہم

توقعات وابستہ کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن اس دور کے افسانہ نگار بہت جلد ادب کے افق سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ان کی ادبی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ تقسیم کے بعد جیلانی بانو اور واجدہ تبسم وغیرہ نے بعض افسانے لکھے تھے جن کی بنا پر ان سے امیدیں تھیں لیکن بہت جلد ان لوگوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ بالکل نئے لکھنے والوں میں اے حمید اور قاضی عبد الستار کے اندر بڑی اچھی صلاحیتیں ہیں۔ اے حمید کا "زرد گلاب" ایک اچھی کہانی تھی۔ اس کہانی میں رومانیت اور حقیقت کا خوبصورت امتزاج ہے لیکن افسوس ہے کہ اے حمید نے بھی خاموشی اختیار کر لی ہے۔ قاضی عبد الستار کے افسانوں میں جزئیات کی پیشکش اور فضا آفرینی بہت کامیاب ہے ان سے بہت توقعات ہیں اور ان میں بے شک ایک اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار بننے کی صلاحیت ہے۔ لیکن یہاں میں ایک خطرے کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

ہمارے بعض نئے افسانہ نگار قرۃ العین حیدر سے بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں بعض اچھی صلاحیتوں کے افسانہ نگار اسی بنا پر اپنی انفرادیت کھو بیٹھے۔ یونس رضوی اس کی اچھی مثال ہیں۔

آخر میں پروفیسر آل احمد سرور نے بھی افسانے کے میلانات سے متعلق مختصر طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے منٹو کے منفی نقطہ نظر کی خامیوں کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی۔ عصمت اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں نے جس طرح زبان کے امکانات کو آگے بڑھایا ہے اس کا بھی تذکرہ کیا اور آخر میں پروفیسر اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کا شکریہ ادا کیا۔

(خدیجہ عبد اللہ سکریٹری)

صفحہ ۸ سے آگے

اگست ۱۹۶۶ء میں بمبئی سے شائع ہونے والے ماہنامہ شاعر میں ڈاکٹر عبد العلیم نامی کا ایک مضمون "اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈرامہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۶۲ء میں ان کی کتاب "اردو تھیٹر" کراچی سے شائع ہو چکی ہے جس میں انھوں نے اندر سبھا کو ڈرامہ کے بجائے رہس اور جلسہ کہا ہے جیسا کہ خود امانت نے بھی لکھا ہے۔ لیکن نامی صاحب یہ بات کہہ کر اسے ڈرامہ ماننے کو شاید تیار نہیں۔ غالباً وہ ڈرامہ صرف اسی کو سمجھتے ہیں جو جدید اسٹیج پر کھیلا جائے اور صرف نثر میں ہو کیونکہ شاعر کے محولہ بالا نمبر میں وہ "خورشید" کو اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈرامہ مانتے ہیں جو ۱۸۷۱ء میں انھیں کے بیان کے مطابق اسٹیج ہوا، اور واجد علی شاہ کے رہسوں اور اندر سبھا کا نام اس سلسلے میں نہیں لیتے۔ واجد علی شاہ اور امانت کے رہسوں کو انھوں نے یہ لکھا ہے کہ جب تک اس قسم کے چھوٹے چھوٹے دریدہ دہنی بیانات اردو ادب کی تاریخ میں زندہ رہیں گے اردو تھیٹر کی صحیح تاریخ مرتب نہیں ہو سکے گی۔

اس سلسلے میں اس مضمون پر بحث کرنا مقصود نہیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اردو والے ڈراما یا "تھیٹر" کا لفظ کب سے استعمال کرنے لگے اس کی تاریخ دیکھنی پڑے گی کیونکہ امانت کے دور تک اردو میں ڈراما کے لیے جلسہ اور رہس ہی کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ واجد علی شاہ اور امانت نے بھی یہی لفظ استعمال کیا۔ ڈراما، نامی صاحب کے نزدیک اگر صرف نثر ہی میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ منظوم نمونوں کو انھوں نے ڈرامے کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ تو پھر دور جدید کے بہت سے شہ پاروں کو کن خانوں میں رکھا جائے گا مثال کے لیے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے منظوم ڈرامے cocktail party family re-union، murder in cathedral، سٹیفن اسپنڈر کے ڈرامے Mary Stuart Trial of a Judge جو پانچ ایکٹ میں ہے اور انھیں کے ساتھ ساتھ ٹینسی ولیمس Tennessee Williams وغیرہ کے منظوم ڈراموں کا کیا بنے گا؟ انگریزی کے ابتدائی ڈرامے طوفان نوح (Noah's Flood) اور ہیرڈ اور مگی (Herod and the Magi) جن میں فرشتے بھی کام کرتے ہیں یہ سب انگریزی ڈرامے کی تاریخ سے کیا "پرچہ وچڑ" کہہ کر نکال دیے جائیں گے؟ میرا خیال ہے کہ شمالی ہند اور جنوبی ہند کی اولیت کے جذبے کو ادب کی تاریخ میں گھسیٹنا مناسب نہیں۔ ڈرامے کا جہاں تک نثر میں ہونے کا سوال ہے رادھا کنھیا میں اچھے خاصے نثری مکالمے بھی ہیں۔ یہ ڈرامہ واجد علی شاہ کی کتاب بنی میں شامل ہے جسے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنی کتاب لکھنؤ کا شاہی اسٹیج میں بھی شامل کر لیا ہے۔ اندر سبھا کا ڈرامہ اودھ کے اسٹیج پر امانت ہی کے سامنے کھیلا بھی گیا اور پھر بعد کو سارے ہندوستان میں پارسی کمپنیاں کھیلتی پھریں۔ واجد علی شاہ نے اپنے رہسوں کے کھیلنے کے لیے آج کا تھیٹر (اتنا جدید نہ سہی) بھی بنوایا تھا جنھیں رہس منزل اور رہس خانوں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

جہاں تک اندر سبھا اور واجد علی شاہ کا تعلق ہے کسی معقول اور محتاط محقق نے اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ اندر سبھا واجد علی شاہ کے لیے یا ان کے اشارے سے لکھی گئی تھی اور واجد علی شاہ اس میں پارٹ کرتے تھے عبد السلام ندوی کا جو بیان نامی صاحب نے تحریر فرمایا ہے اس سے یہ بھی بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان کے لکھنے کا یہ مطلب ہے۔ اس بات کے انکار میں نامی صاحب نے جو فرامین، دستاویزات اور واجد علی شاہ کی تصنیفات میں امانت کا تذکرہ نہ ہونے کی بات اٹھائی ہے، وہ بھی کوئی نئی بات نہیں پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب اپنی کتاب اردو ڈرامہ اور اسٹیج میں بڑی تفصیل اور تحقیق سے ص ۱۹۰ سے ص ۲۱۱ تک مقدمۂ اندر سبھا میں لکھ چکے ہیں۔ امانت نے شرح اندر سبھا میں خود ہر بات کی وضاحت کر دی ہے۔ بغیر ان سب کے مطالعہ کے اس طرح کے خیالات کا اظہار کر دینا بڑا گمراہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

(ختم شد)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا اور پبلشر نذیر حسین نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا